حسینؑ اور اسلام

سید العلما مولانا سید علی نقی نقوی

ـہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان، کراچی ڈویژن
داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی یونٹ

عرضِ ناشر
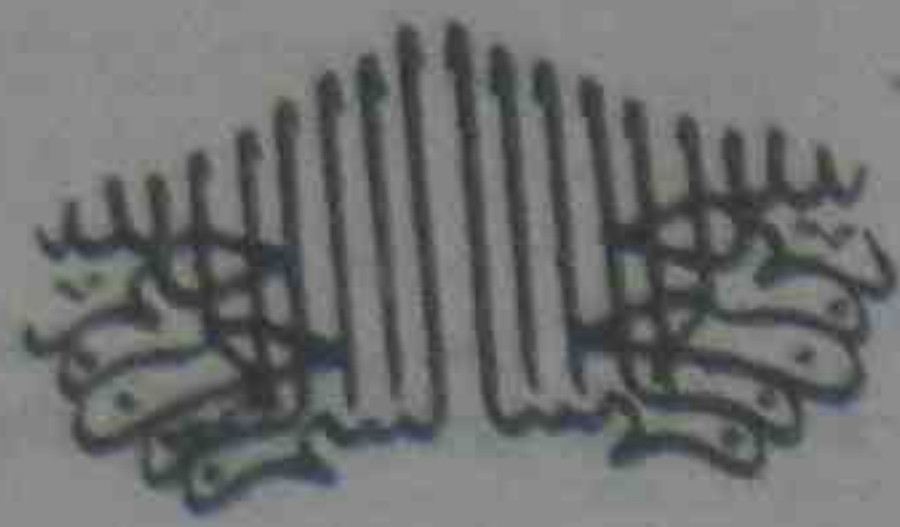
یوں تو الستُ بربکم کا عہد کرنے والی بہت سی ارواح نے اپنے رب کی راہ میں بے مثال قربانیاں پیش کی ہیں لیکن جو مقام حسین ابن علیؑ ابن ابوطالب اور ان کے رفقاء کی قربانیوں کو حاصل ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

یہ قربانیاں دیگر قربانیوں کے مقابلے میں اتنی منفرد ہیں کہ شخصی اعتبار سے واقعۂ کربلا حق اور سچائی کے استعارے بن گئے ہیں۔ آج ہر سچائی پسند انسان کے لیے حسینؑ کی ذات حق کی علامت بھی ہے اور سچائی کا جواز بھی اپنے نظریے سے منسلک ہو جانے کی یہ مثال جناب ابراہیمؑ اور سقراط کی قربانیوں سے بھی زیادہ گراں ہے۔

آج ساری دنیا کے مستضعف وحدت کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں اور بیشتر اسلامی ممالک کے منافق حکمران انقلاب اسلامی سے ہراساں ہیں۔ ایسے وقت میں بالعموم تمام مستضعفین جہاں کے لیے اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے امام حسینؑ کی ذات ایک پلیٹ فارم کا درجہ رکھتی ہے۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے پیغام اور واقعات کربلا و کوفہ و شام کو اجاگر کیا جائے تاکہ مظلوموں کے راستے کا تعین ہو سکے۔ نیز اسلام اور انسانیت کی روح کو سمجھا جا سکے۔

سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب نقوی قبلہ کی یہ مختصر تصنیف حسینؑ

اور اسلام ،، امام حسین کی ذات، واقعاتِ کربلا کے پس منظر اور بعض پہلوؤں سے ہماری فکر کو روشناس کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مولانا کی علمی حیثیت سے سارا عالمِ اسلام واقف ہے۔ انہوں نے اپنی اس تصنیف میں نہایت عام و سادہ اور مدلل طرزِ بیان اختیار کیا ہے۔

اراکین امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی یونٹ نے فیصلہ کیا کہ اس مختصر رسالہ کو جو تشکیل پاکستان سے چند سال قبل امامیہ مشن لکھنؤ کے زیرِ اہتمام آخری بار شائع ہوا تھا۔ دوبارہ زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جائے تاکہ طلبا اصل فکر حسین ؑ سے روشناس ہو سکیں۔ ہم نے اپنے محدود وسائل کے باوجود کتاب کو معیاری بنانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اسے پڑھئے اور ہمیں اپنی قیمتی آراء سے ضرور نوازئیے۔

دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں تعلیمات اسلامی سے زیادہ سے زیادہ واقفیت پیدا کرنے اور اس پر عمل کر کے سعادت دارین حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

والسلام

سیکریٹری نشر و اشاعت

امامیہ اسٹوڈینٹس آرگنائزیشن پاکستان کراچی ڈویژن

داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی یونٹ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ

حسینؑ اور اسلام

حسینؑ تاریخی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں، انکی شخصیت اور عظیم کارنامے کروڑوں افراد کے سر عقیدت کو خم کئے ہوئے ہیں تم نے ممکن ہے کہ ان کے عظیم کارنامۂ زندگی کے مطالعہ اور ان کے حیرت انگیز ثبات قدم اور استقلال و تدبر سے بھرے ہوئے بے مثال اقدام اور قربانی کے حالات پر اطلاع حاصل کرنیکا موقع نہ پایا ہو لیکن کم سے کم تم نے حسینؑ کا نام ضرور سنا ہوگا اور اتنا جانتے ہو گے کہ وہ کسی بڑے تاریخی واقعہ کے ہیرو ہیں۔ ممکن ہے یہ خیال بھی تمہارے

دل میں یہ آتا ہو کہ یہ حسینؑ کون تھے اور آخر اس واقعہ کے کیا

خصوصیات ہیں جو اس بڑے انسان کی ذات سے تعلق رکھتے

ہیں۔ اچھا تو آؤ اور صبر و سکون کے چند لمحے مجھکو عاریت دو۔

میں تم کو حسینؑ اور ان کے مشن سے جس کے سلسلہ میں انہوں

نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے میں دریغ نہیں کیا، مختصر لفظوں

میں شناسا کراؤں جس سے تم کو حسینؑ اور ان کے اقدامات کے

متعلق صحیح رائے قائم کرنیکا موقع مل سکے۔

حسینؑ کون تھے؟

حسینؑ کیساتھ اسلام کا روحانی تعلق

چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ دنیا تاریکی کے عظیم دور سے

گزر رہی تھی اور انسانی تمدن کی کشتی تفرقہ اور طوفان کے فساد

سے ڈانواڈول تھی جزیرہ نمائے عرب سے اسلام کا آفتاب

طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کے مرکزی مقام مکہ

معظمہ سے ظاہر ہوئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ اس کی روشنی شرق و غرب عالم پر چھا گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔

یہ ہر دلعزیز اور عالمگیر مذہب جس کا نام ہے اسلام اپنے ابتدائی دور میں ترقی واشاعت کی حیثیت سے دو عظیم شخصیتوں کی جانفشانی اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ایک پیغمبر اسلام محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم، دوسرے ان کے چچازاد بھائی علیؑ بن ابی طالبؑ۔

اگرچہ دوسرے بہت سے صحابہ کرام نے جو خدمات انجام دی ہیں اور جانثاری وفداکاری کے فرض کو انجام دیا ہے انکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں لیکن ان کا اسلام کے سنگِ بنیاد نصب ہونے اور اس کے بعد والے ابتدائی مراحل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کے بعد انہیں اساسی حیثیت دی جا سکتی ہے بلکہ وہ ضمنی

حیثیت رکھتے ہیں لیکن حقیقتاً انہی دو بزرگوں کے ثبات قدم

اور حیرت ناک استقلال اور اپنے خون کو پسینہ سمجھ لینے کا اثر تھا

کہ اسلام کی بنیادیں قائم ہوئیں اور حیرتناک تیزی کے ساتھ اسکی

اشاعت ہوئی۔

قدرت کو ان دونوں بھائیوں کے اتحاد کو مضبوط سے

مظبوط تر بنانا تھا۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کی اکلوتی بیٹی حضرتِ

فاطمہ سلام اللہ علیہا کیساتھ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا عقد

ہوا اور اس طرح علیؑ کو بھائی ہونے کے علاوہ ایک قسم کی فرزندی

بھی رسولؐ سے حاصل ہو گئی اور یہ دونوں سلسلے کہ جو اشاعتِ

اسلام میں متحد تھے اور زیادہ استحکام کیساتھ ایک نقطہ پر جمع ہو گئے

انہی ماں باپ حضرت فاطمہؑ اور علیؑ ابنِ ابی طالبؑ سے

دو بچے متولد ہوئے جن کا نام تھا حسنؑ اور حسینؑ اور عین

اس وقت جب اسلام ایک نو عمر بچہ کی حیثیت سے رسولِ اسلام

کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا ان دونوں بچوں کی ولادت
ہوئی جن کی پرورش بھی آغوشِ رسول میں شروع ہوئی، اور
اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا گہوارۂ تربیت ایک قرار
پایا۔ ایک طرف نانا کہ جو بانیٔ اسلام تھے اور دوسری طرف باپ
کہ جو مجاہد محافظِ اسلام تھے۔ انکی خدمات اور کارگزاریاں سامنے
تھیں اور اس ماحول کے باعث اسلام کے ساتھ روحانی تعلق
اور دلی ارتباط ان دونوں بچوں میں بچپنے ہی سے راسخ ہو گیا
اور جتنی عمر بڑھتی گئی الفتِ اسلام کا جذبہ مستحکم تر ہوتا چلا گیا۔
مذہبی عقائد سے جنکی بنا پر یہ دونوں بزرگ (حسنؑ
و حسینؑ) امامِ خلق اور حقیقی ذمہ دارِ اسلام قرار پاتے ہیں بالکل
الگ ہو کر تاریخی اعتبار سے بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ
ان دونوں بزرگوں کی زندگی پابندیٔ شریعت اور حفظانِ اصول
مذہب کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کا مکمل آئینہ اور احکامِ

شریعت کا مجسم نمونہ تھی اور اس لئے بھی اسلام اور شریعت اسلام کے ساتھ جتنی گہری ہمدردی ان کو ہو سکتی ہے کسی اور کو نہیں۔

بنی امیہ کا دور
یا
تاریخ کا ایک سیاہ ورق

پیغمبر اسلام کی وفات اسلام کے لیے ایک سخت ترین مصیبت تھی جس کے بعد ہی سے اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ شروع شروع میں کچھ عرصہ تک اسکی سادگی اور حقیقت پروری، ظاہری جاہ وعزت سے بے تعلقی اور مادی ساز و سامان سے کنارہ کشی ایک حد تک

محفوظ تھی لیکن ادھر فتوحات نے ترقی کی۔ قیصر و کسریٰ کے ممالک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ شاہانہ تزک و احتشام اور سلطنتی جاہ و جلال سے آنکھیں دوچار ہوئیں ادھر اسلامی افراد میں بھی کشور آرائی اور جہانبانی کے جذبات نے پرورش پائی اور مذہبی پابندیوں کے بجائے سیاسی منصوبہ بازیوں اور کمزوروں کے مقابلہ میں جابرانہ طاقتوں کے مظاہرہ کا دور دورہ ہو گیا۔

رسولؐ اور ان کے خاندان (بنی ہاشم) کے قدیمی حریف بنی امیہ کہ جو برابر رسولؐ سے اشاعت اسلام کیخلاف اپنی طاقت کے آخری نفس تک جنگ کرتے رہے اور سب سے آخر میں امید کے تمام رشتے منقطع ہو جانے کے بعد بادل ناخواستہ اسلام لائے تھے انہیں ان انقلابات میں اپنے منصوبوں کے پورا کرنے کا اچھا موقع ملا۔

حضرت خلیفۂ ثانی (عمر بن الخطاب) ہی کے دور میں

شام پر ان کا تسلط ہو گیا تھا جو صرف گورنر کی حیثیت سے

تھا لیکن قدم جمانے کے لیے بہت کافی تھا۔

تیسرے دور میں خوش قسمتی سے مرکزی حکومت یعنی

خلافت کا سہرا بھی بنو امیہ کے سر پر بندھا اور اس گروہ کو

اسلام کے ساتھ اپنے دیرینہ منصوبوں کو پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا

حضرت خلیفۂ ثالث کے ساتھ حسنِ ظن کو راہ دیتے ہوئے

یہ کہا جا سکتا ہے کہ صاف سادہ لوح خلیفۂ وقت کو اپنے ان

خاندانی افراد کے اغراض و مقاصد اور ان کے اطوار و حالات

کی اطلاع نہ تھی لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس عہد میں

صحابۂ رسولؐ اور سچے اسلامی فرزندوں کے ساتھ انتہائی

شرمناک برتاؤ اختیار کئے گئے اور انہوں کی جانبداری اور انکے

بدترین مظالم کو برداشت کرتے کرتے صبر کے پیمانے لبریز ہو

گئے جس کا افسوس ناک نتیجہ قتلِ خلیفہ کی صورت میں ظاہر ہوا

تاریخ کے مطالعہ سے اس قتل کی بہت کچھ ذمہ داری بنوُ

امیہ کے سر دکھائی دیتی ہے۔

اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور خلافت کے لئے

بڑے بڑے صحابہ کرام اور اہل حل و عقد کے اتفاق آراء سے

حضرت علیؑ کا انتخاب ہوا اور سب نے بالاتفاق آپکی بیعت

کی لیکن شام کے گورنر معاویہ بن ابوسفیان جو وہاں پورے

طور پر قبضہ جما چکے تھے وہ اسلامی متفقہ فیصلے کے سامنے

سرنگوں ہونا تھے نہ ہوئے اور خون حضرت عثمان کی طلب

کے بہانے سے علیؑ ابن ابیطالبؑ سے برسرِ پیکار ہوئے چنانچہ

جنگ صفین کے سینکڑوں معرکے جن میں ہزاروں مسلمانوں کا

خون پانی کی طرح بہہ گیا اسی کا کرشمہ تھے۔

آخر اس جنگ کا فیصلہ ایک مکارانہ مصالحت کیساتھ

ہوا جس میں اگر دیانت و امانت کا جوہر کارفرما ہوتا تو یقیناً
مسلمانوں کے درمیان سے ناگوار اختلافات کا خاتمہ ہو سکتا
تھا لیکن افسوس کہ حرص و آز کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے
اس ظاہری مصالحت کو فتنہ و فساد کا پیش خیمہ قرار دے
دیا اور اختلاف و افتراق کی خلیج پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئی۔
یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنو امیہ کے قدم پوری
طاقت کے ساتھ جم گئے تھے ادھر امیر المومنین علیؑ کو مسجد کوفہ
میں شہید کیا گیا ادھر شام میں مخالفتِ اہلبیت کا طوفان
پوری قوت پر بلند ہو گیا اور دمشق بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ کے
منبروں پر بکمالِ جرأت کیساتھ اہلبیتِ رسولؐ پر لعن طعن
کا بازار گرم ہو گیا۔

اس زمانہ کی بعض خصوصیات امیر معاویہ اگرچہ صحابۂ رسولؐ کی ایک ممتاز شخصیت سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کے دورِ حکومت کے یہ افسوسناک خصوصیات ہیں جو اسلامی تاریخ میں جلی حرفوں سے مرقوم نظر آتے ہیں اور اُن سے اس زمانہ میں اسلام کے ضعف و کسمپرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) وضع احادیث اور خدا اور رسولؐ پر افترا و بہتان کوئی جرم نہ رہا بلکہ اس پر مخصوص مصالح کے ساتھ میں جائزہ انعام دیا جاتا تھا چنانچہ ابوالحسن علی بن محمد مدائنی جو اسلامی مؤرخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے اس نے کتاب الاحداث میں اس زمانہ کے حالات کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

کتب معاویۃ الی عمالہ فی جمیع الآفاق ان لایجیزوا لاحد من شیعۃ علی شہادۃ وکتب علیہم ان انظروا من قبلکم من شیعۃ

عثمان ومحبیہ واھل ولایتہ الذین یروون فضائلہ ومناقبہ

فادنوا مجالسھم وقربوھم واکرموھم واکتبوا الی بکل مایروی کل

رجل منھم واسمہ واسم ابیہ وعشیرۃ ففعلو ذالک حتیٰ

اکثروا فی فضائل عثمان ومناقبہ لما کان یبعثہ الیھم معاویۃ

من الصلات والکساء والحباء والقطائع ویفیضہ فی العرب منھم

والموالی فکثر ذالک فی کل مصر وتنافسوا فی المنازل والدنیا فلیس

یجد امرء ومن الناس عاملا من عمال معاویۃ فیروی فی عثمان

فضیلۃ او منقبۃ الا کتب اسمہ وقربہ وشفعہ فلبثوا بذالک

حینا۔ معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی

فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اس کا پورا نام معہ پتہ کے

میرے پاس لکھکر بھیج دو اور پوری طرح جائزہ وانعام سے اس

کو مالامال کر دو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت عثمان میں احادیث

کثرت سے ہوگئیں اور مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔

ثم کتب الی عماله ان الحدیث فی عثمان قد کثر و فشا فی کل مصر و کل وجه وناحیة فاذا جاءکم کتابی هذا فادعوا الناس الی الروایة فی فضائل الصحابة والخلفاء الاولین ولا تترکوا خبرا یرویه احد من المسلمین فی ابی تراب الا واتونی بمناقض له فی الصحابة فان هذا احب الی واقر لعینی وادحض لحجة ابی تراب وشیعته واشد علیهم من مناقب عثمان وفضله فقرأت کتبه علی الناس فرویت احادیث کثیرة فی مناقب الصحابة مفتعلة لا حقیقة لها وجد الناس فی روایة ما یجری هذا المجری حتی اشادوا بذکر ذلک علی المنابر والقی الی معلمی الکتاب فعلموا صبیانهم من ذلک الکثیر الواسع حتی رووه وتعلموه کما یتعلمون القرآن وحتی علموه بناتهم ونساءهم وخدمهم وحشمهم فلبثوا بذلک ماشاء اللہ۔

پھر تمام گورنروں کو لکھا گیا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اب تم دیگر صحابہ کے فضائل میں

روایت احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت

بھی بوتراب کی نسبت احادیث میں وارد ہے اس کے مقابل

دوسرے صحابہ کیلئے بھی بیان کرو۔ علیؑ اور ان کے شیعوں کی دلیل

کے باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ فرمان

لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور سینکڑوں حدیثیں صحابۂ کبار کے مناقب

میں تصنیف ہو گئیں جن کی کچھ اصلیت نہ تھی واعظین ان کو منبروں

پر پڑھتے اور معلمین مکتب بچوں کو قرآن کی طرح حفظ کراتے

تھے بلکہ لڑکیوں عورتوں اور غلاموں کنیزوں تک کو یاد کرانا ضروری

سمجھتے تھے"۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت

اخبار کے ساتھ مخلوط ہو کر بے اعتبار بن گئے اور علمی تحقیق و تدقیق

میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۲) سب و شتم اور اکابر اہلِ اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکل

آیا دمشق و شام کے منبروں پر چالیس برس تک یہ رسم ادا ہوتی رہی اور علیؑ بن ابیطالبؑ کی نسبت اس جسارت کا سلسلہ قائم رہا۔ (۳) بلادِ اسلامیہ میں شراب بہت آزادی کے ساتھ استعمال کی جانے لگی اور اس کی خرید و فروخت میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی چنانچہ عبدالرحمٰن بن سہل انصاری (صحابیٔ رسولؐ) نے شراب کے بارے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھا تو اپنے نیزہ کی نوک سے ان مشکوں کو پھاڑ ڈالا۔ حضرت معاویہ کو خبر معلوم ہوئی تو کہا کہ اس بڈھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ جب عبدالرحمٰن نے یہ سنا تو کہا خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسالت مآبؐ نے ممانعت فرمائی ہے اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل ہو یا برتنوں میں رکھی جائے (دیکھو کتاب اسد الغابہ ابنِ اثیر جزری ج ۳ صہ ۲۹۹ و اصابہ حافظ ابن حجر عسقلانی ج ۲ صہ ۱۴۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں درآمدِ شراب مسلمانوں میں

بہت خوبی سے ہو گئی تھی اور اگر کوئی سچا مسلمان تعرض کرتا تھا

تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا۔

(۴) بیگناہ مسلمانوں کا خون بہت بے دردی سے بہایا جانے

لگا سینکڑوں کلمہ گویوں کی گردنیں زیرِ تیغ ہو گئیں، سمرۃ بن جندب

اور بسر بن ارطاۃ اور زیاد بن ابیہ کی سیاہ کاریاں اسی عہد کا نامۂ عمل

ہیں۔ عبداللہ بن عباس کے دو کمسن بچے ماں کی گود میں ذبح کر دیے

گئے جس سے وہ مجنون ہو گئیں (ملاحظہ ہو استیعاب ابنِ عبدالبر

مطبوعۂ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد اول صہ ۶۶)

(۵) مذہب کا وقار بالکل کم ہو رہا تھا اور بڑے سے بڑے

ارکانِ مذہبی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

امیر معاویہ نے بڑے فخر سے جاریہ بن قدامہ اور احنف دو

شخصیتوں کی نسبت فرمایا کہ اشتریت منہما دینھما میں نے

ان کا مذہب ان سے مول لے لیا ہے" استیعاب ج ۱ ص ۱۵۴

مصر کے لوگوں نے دربار میں آکر السلام علیکم یا رسول اللہ کہا اور اس کو گوارا کر لیا گیا۔ سزا دینا تو بڑی بات تھی معمولی سی زبانی تنبیہہ بھی نہ کی گئی (ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۸۴)

ان دونوں واقعوں کو ہم نے اپنے رسالہ "قاتلانِ حسینؑ کا مذہب" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اور اس سے اس وقت کے اسلامی احساسات و جذبات کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

امیر معاویہ کا زمانہ کسی نہ کسی طرح بسر ہو گیا اور انہوں نے اپنی عمر گزار دی مگر مسلمانوں کے سر پر ظلم و ستم کے ایسے دیوتا کو سوار کر گئے جس نے اسلام کے شیرازہ کو بالکل درہم برہم کر دیا۔ یزید کے اخلاق و عادات سے امیر معاویہ بے خبر تھے؟ نہیں ہرگز نہیں وہ خود یزید کے خصوصیات سے واقف تھے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے چنانچہ علامہ ابن حجر مکی اپنی کتاب "تطہیر اللسان والجنان" میں

جو حضرت معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی گئی ہے، لکھتے ہیں کہ ایک روز امیر معاویہ رونے لگے۔ مروان نے کہا کہ کیوں کیا ہوا؟ آپ کے رونے کا سبب؟ جواب دیا کہ

" ای شیئی کنت عنہ عزو باکبرت سنی ورق عظمی وکثرت الدموع فی عینی ورمیت فی احسن ما ایبد ومنی ولولا ھو ای فی یزید البصرت قصدی "۔

" دنیا میں کونسی راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو۔ اب سن زیادہ ہو گیا ہے ہڈیاں گھل گئیں جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبّت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لئے راہ راست حاصل کر لیتا۔"

(حاشیہ صواعق محرقہ۔ مطبوعہ مصر صد ۵۶) علامہ ابن حجر لکھتے ہیں۔

قولہ ولولا ھو ای الخ فیہ غایۃ التسجیل علیٰ نفسہ بان ضرید محبتہ الیزید اعمت علیہ طریق الھدیٰ واوقعت الناس نعدہ مع ذالک الفاسق المارق فی الردیٰ۔

"ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا تھا اور اسی فرطِ محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوا۔" (حاشیہ صواعق محرقہ صہ ۵۸)

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امیر معاویہ یزید کے افعال و عادات سے بے خبر تھے اور ان کی ولی عہدی نیک نیتی پر مبنی تھی۔ یزید کی بیعت مسلمانوں سے زبردستی لی گئی اور زر و جواہر کے خزانے اس کے لئے وقف کر دیے گئے۔ یزید تختِ خلافت پر متمکن ہوا اور اس کے فسق و فجور نے دنیا کو پُر کر دیا۔ ہر طرف معصیت خدا اور مخالفِ شریعت کا بازار گرم ہوا۔ مذہب بازیچۂ اطفال اور اسلام زینتِ طاقِ نسیاں بن گیا۔ یزید کے افعال و عادات کے تفصیلی تذکرہ سے اِن صفحات کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کی مستند تاریخیں ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ

کئے ہوئے ہیں۔ واقدی نے مختصر الفاظ میں جس طرح یزید کے بدکرداری

کی تصویر کھینچی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

کان رجلا ینکح امہات الاولاد والبنات والاخوات ویشرب

الخمر ویدع الصلواۃ۔

وہ ایسا شخص تھا کہ اپنے باپ کی منکوحہ کنیزوں اور

اپنی بہنوں اور بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتا تھا شراب پیتا تھا اور نماز

کو ترک کرتا تھا۔ (ملاحظہ ہو صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی ص ۱۳۵)

اب بتاؤ کہ کیا اسلامی بادشاہ یا خلیفۃ المسلمین اور مجوسیوں

میں کچھ فرق بھی ہوا؟ حد سے زیادہ فاسق اشخاص بھی اپنی ماں

بہنوں بیٹیوں سے مقاربت کرنا حمیت و غیرت بلکہ انسانیت

کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بادشاہِ وقت کے ان عادات و اخلاق

کو دیکھ کر دنیا نے رنگ پکڑ لیا تھا اور مذہبیت بالکل فنا ہو

گئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ سر تسلیم خم کئے

ہوئے تھے اور کسی کے دہن سے صدائے اعتراض بھی بلند نہ ہوتی تھی۔ سوائے پانچ شخصوں کے تمام صحابہ و تابعین یزید کو خلیفہ رسولؐ تسلیم کر چکے تھے۔ ان پانچ میں سب سے پہلا نام حسینؑ بن علیؑ کا ہے اور آپکی دیکھا دیکھی میں عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عباس۔

یزید کی طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ ان کو بھی پابند بنایا جائے اور سب سے زیادہ امام حسین علیہ السلام کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کے لیئے اہتمام کیا گیا

گزشتہ تاریخ اور اسلام کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کا فرزند اور خاندانِ رسولؐ کا سب سے بزرگ شخص اگر ان حالات کی موجودگی میں یزید کی بیعت کر لیتا تو اسلام کا نام بھی باقی نہ رہ سکتا

...

حسن مجتبیٰؑ کی صلح مجاہدۂ کربلا کی تمہید تھی

ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید، نتیجہ خیز اور موثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے کیا جائے تو وہ نتیجتہً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے کرنے والے کو ہمیشہ کیلئے موردِ الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور ان کا طریقہ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہو جاتا ہے۔ عالم کا نظام اسی پر قرار پایا ہے اور انسان کی افتادِ طبع یوں ہی واقع ہوئی ہے اس میں تغیّر و تبدّل کا امکان نہیں۔

زخم رسیدہ پکے ہوئے جزوِ بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو، مچاہے لگاؤ، مرہم بدلو، ضرورت ہو تو بار بار نشتر

دلوادُ پھر اگر نہ اچھا ہو اور اس کی سمیّت کے جسم میں سرایئت

کرنیکا خوف ہو تو اُسے کاٹ کر بھی پھینک دو۔ کسی کو اعتراض

کا حق نہ ہوگا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی یا کوئی علاج

معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو موردِ الزام اور عام طور

پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ یہ طرزِ عمل وہی تھا جو بعد میں

کئے جانے پر ممدوح و مستحسن سمجھا جا رہا تھا۔ دشوار گزار حالات

کی اصلاح کیلئے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور

موثّر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری جب تمام وسائل و ذرائع

ختم ہوجائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہو اس وقت اس کا درجہ

ہے۔ وہ جہاں تک آخری رہیں تک ممدوح ہے اور اگر اس

سے پہلے عمل میں آگئی تو اس پر جلد بازی غیر متوقع شناسی اور

ناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد

اس کو حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا اور اسی کے ساتھ اس کی

کامیابی وتاثیر ختم یا رخصت۔

حالات کی اصلاح کیلئے احتجاج واستغاثہ مصالحت

ورواداری شرط وشروط اور قرار داد و معاہدہ یہ ایسی چیزیں

ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔

بیشک جب یہ وسائل و ذرائع اختیار کئے جانے

کے بعد ناکام ثابت ہوں تو پھر "من جرب المجرب حلت

بہ الندامۃ"، "آزمودہ را آزمودن جہل است"، کیمطابق

انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہوسکے گا۔ اور اس کی رفتار

عمل کو آگے بڑھ کر کسی دوسرے اقدام تک پہنچنے کا حق پیدا ہوگا

یہی تدریجی رفتار اقدامِ عمل میں جب تک قائم ہے اس کامیابی

کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہوجانے پر پہلے ہی کٹ مرنے

مارنے پر آمادہ ہوجانے والا مغلوب الغضب کہلائے گا۔

وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع

واسباب کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لئے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فدا کاری اور جاں نثاری اور موثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے افعال و اعمال میں توازن کو ملحوظ رکھتا اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرمانبردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبّر کا پابند ہے تو اُسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔

شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بیشک مذہب خطرہ میں تھا اور حق و صداقت پامال ہو رہے تھے جس کی اصلاح کے لیئے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کیلئے دوسرے پُرامن اور صلح پرور وسائل و ذرائع کے صرف کئے جانے کی ضرورت تھی۔

بیشک اگر امام حسینؑ اکیلے بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدان

اعوان و انصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہو جاتے اور ایسا کرتے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امامؑ نے اتحادِ عمل کے ساتھ حالات کی درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کیساتھ صلح کر کے اپنے مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امورِ سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینۂ رسولؐ میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آکر اپنے تئیں معرضِ خطر میں کس لئے ڈالا؟

یہ سوالات پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی موجود نہ تھا یقیناً آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لیے نہ قابلِ ستائش ہوتا اور نہ موثر و کامیاب لیکن واقعہ یہ تھا کہ امام حسینؑ کا اقدام عمل یا قربانی۔ ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہوا تھا جس کے لیئے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لا رہے تھے یہاں تک کہ ۶۱ھ میں اسکا وقت

آگیا۔

شروع شروع میں امام حسنؑ کا صلح کر لینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کیساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دست کش ہو کر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسینؑ کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا روبہ اصلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا شرائط معاہدہ کا ٹھکرا دیا جانا۔ صلح نامہ کی دفعات کا پامال ہو جانا۔ زبانی احتجاج و استغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا۔ اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے اونچا ہو جانا اور معاملات کا حد سے گزر جانا وہ عوامل تھے جس نے امام حسینؑ کو اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کر دیا تھا کہ جو انہوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔

یہ اعتراض تاریخی حالات سے بے خبری کا نتیجہ ہوگا کہ امام حسینؑ نے خود اپنی جان کو معرضِ خطر میں ڈالا۔ اگر وہ مدینہ میں قیام کرتے اور یزید سے برسرِ پرخاش نہ ہوتے تو آپ کا خون کربلا کی زمین پر نہ بہتا۔

یہ خیال بالکل بے حقیقت ہے۔ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم اور خصوصاً علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کی اولاد سے اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کسی طرح ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتے تھے اور ان کی خاموش ہستی بھی ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی تھی۔ حسن مجتبیٰؑ نے باوجود صلح جوئی اور خاموشی و کنارہ کشی کے کیا پھل پایا؟ یہ کہ زہرِ قاتل کے اثر سے کلیجہ کے ٹکڑے ہوئے اور دشمنوں کی ظلم و بیداد کا خاموش افسانہ سناتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔

جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی اپنی کتاب یزید نامہ صہ ۸۳ پر لکھتے ہیں۔

"پہلا خون سیدنا حضرت امام حسنؑ کا ہے جو تاریخ کی

روایت سے قطعاً امیر معاویہ کے اوپر ثابت ہے اور کوئی جدید و قدیم

محاکمہ تاریخی و قانونی انکی بریت اس قتل سے نہیں کر سکتا۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسینؑ عراق میں نہ آتے اور

مدینہ میں قیام فرماتے تو ان کے قتل کے لیے کوئی ایسا ہی خاموش

حربہ استعمال نہ کر دیا جاتا جس طرح حضرت امام حسنؑ پر استعمال کیا گیا۔

اس وقت آپ کی جان بھی جاتی اور افراد بشر کے سامنے

حقیقت کے واضح ہونے کا بھی کوئی طریقہ نہ ہوتا بلکہ جس طرح اس

سے پہلے امام حسنؑ کی شہادت سے انکار کیا جاتا رہا اسی طرح

حضرت کی شہادت سے بھی انکار کرنا ضروری خیال کیا جاتا اور یہ

یقیناً یزید کی فتح اور حسینؑ کی شکست قرار پا سکتی تھی کیونکہ

اس حالت میں اول الذکر نے اپنے مقصد کو حاصل کیا۔ حسینؑ

کے وجود کو دنیا سے محو کر دیا اور پھر عالم کے سامنے اپنے تئیں بری

بھی ثابت کر دیا اور حسینؑ نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا اور کوئی

نتیجہ خیز اثر بھی دُنیا میں نہ چھوڑا۔ بھلا حسینؑ جیسی محیّر العقول تدبّر

و استقلال کی مالک ہستی سے کب توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ

اس پہلو پر متوجہ نہ ہو۔ حسینؑ نے اپنے معاملہ کو دو مختلف صورتوں

میں منحصر پایا۔ ایک یہ کہ خاموش طریقہ پر اپنی جان سے ہاتھ دھوئیں

اور دین اسلام و شریعت نبویہؐ بھی یزید کے افعال و اقوال سے

محو ہو کر رہے دوسرے یہ کہ اپنی ہستی کو ظاہری صورت میں دستِ

فنا کے سپرد کر کے ہمیشہ کے واسطے اپنی اور اپنے نانا کی تحریک کو

زندہ کر کے اسلام کا ایک پائیدار نقش چھوڑ دیں۔ فرزندِ رسولؐ نے

اپنے عظیم تدبّر و عاقبت اندیشی سے کام لے کر دوسری صورت کو

ترجیح دی اور اسلام کو زندہ کرنیکے ساتھ اپنی موت کو اپنے اور اسلام

دونوں کی فنا کے مقابلہ میں اختیار کیا۔

حسینؑ نے اپنی جان دے کر اپنے مخالفین کے مفاد کو

ہمیشہ کیلئے پامال کر دیا۔ اور یہی وہ عظیم فتح ہے جس کو حضرت نے ظاہری صورت میں فنا ہو کر حاصل کیا۔
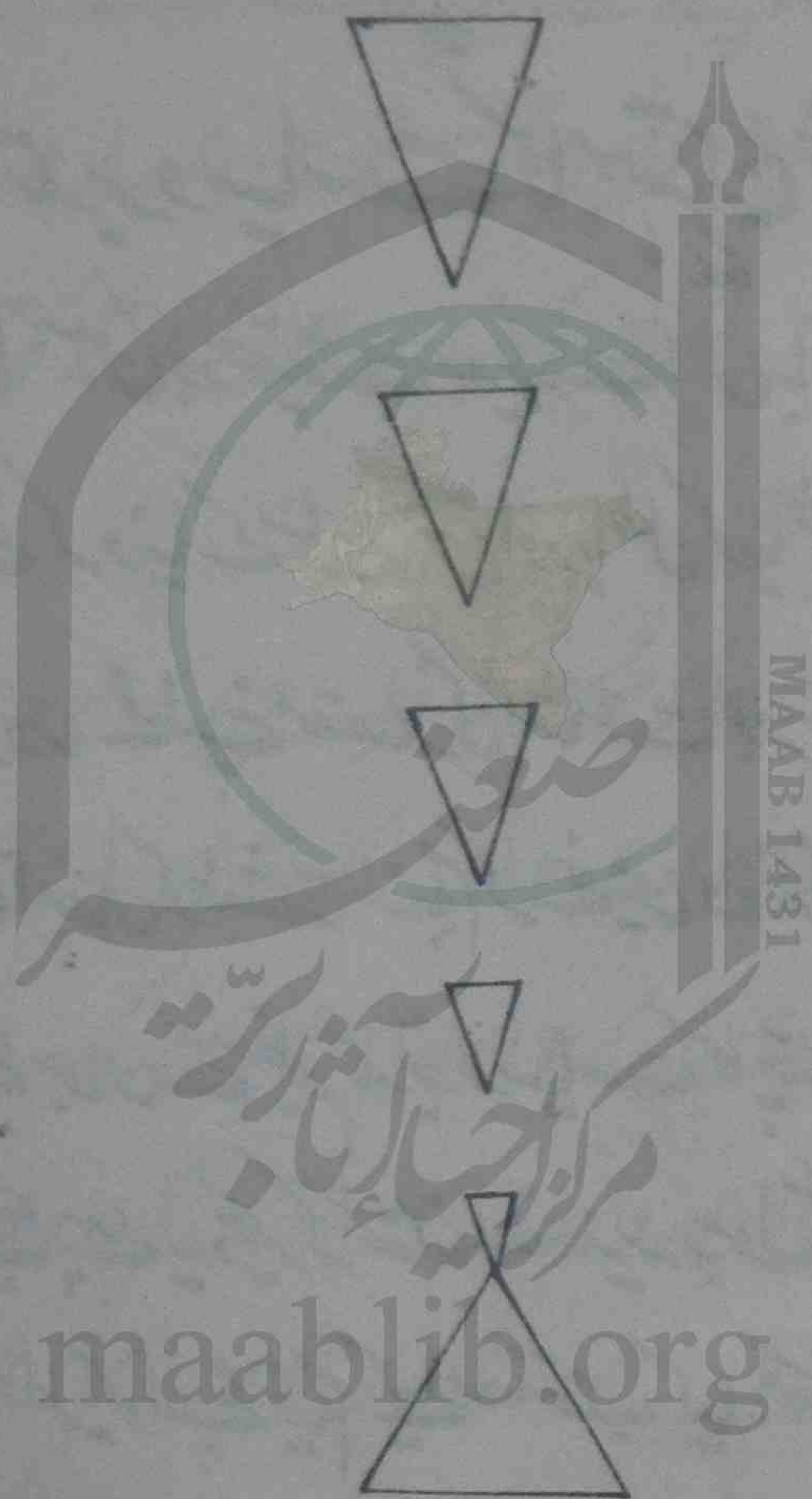
حسینؑ کا اقدام عمل خالص تبلیغی شان رکھتا تھا

اور

تدبیر و سیاست کا بہترین نمونہ تھا

امام حسینؑ درحقیقت مدینہ سے اس بات کا بیڑہ اٹھا کر نکلے تھے کہ دنیا کے سامنے حق اور باطل کو ظاہر کردیں چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کی اشاعت اور یزید کے ننگِ انسانیت افعال کو طشت از بام کرنے میں وہ تمام وسائل و ذرائع اختیار کئے جو ان کے عظیم تدبر و سیاست کا پتہ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھو کہ حسینؑ نے مدینہ رسولؐ کو چھوڑنے کے بعد مکہ معظمہ کو اپنے قیام کیلئے منتخب کیا، مکہ معظمہ کا قیام سطحی نظروں میں تو اس غرض کے لیئے تھا کہ اس مقامِ مقدس میں خونریزی حرام ہے لہٰذا ان کی زندگی دشمنوں کے خطرے سے

محفوظ رہے گی لیکن یہ نقطۂ نظر ایسے شخص کے لئے تسلیم کیا
جا سکتا ہے جس کو آخر تک جان بچانا منظور ہو مگر حسینؑ جو کہ
مرنے پر کمر باندھ چکے تھے۔ اور پورے طور سے آخر تک ہونے
والے واقعات پیشِ نظر رکھتے تھے جس کو برابر الفاظ میں
بتلاتے بھی رہتے تھے ان کی نسبت اس خیال کو کوئی وقعت
نہیں دی جا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ قلب جزیرۃ العرب اور عالم
اسلام کا مرکز تھا اطراف و جوانب کے قافلے برابر آتے رہتے
تھے اور علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر
مستطیع مسلمان پر واجب ہے اور جس کی بدولت اشہر
حج میں چاروں طرف سے مختلف قبائل عرب کا آنا جانا ضروری
ہے خود عرب کی قدیم روایات اور سابقہ عمل درآمد کی وجہ سے
جو صدیوں سے قائم تھا اور اسلام نے بھی جس کو باطل کرنے کی

ضرورت نہ سمجھی تھی عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف الخیال
قبائلِ عرب کا محل اجتماع ہونا لازمی تھا وہ مشہور کانفرنسیں
جو شعر و سخن اور خرید و فروخت وغیرہ کے لیئے قائم ہوتی تھیں
جن کو اسواق العرب کہا جاتا ہے۔ ہر ذی قعدہ سے لیکر محرم
تک مکہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی میں قائم ہوتی تھیں
امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی
تھی اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے ہوں اور حسینؑ کو ان
کے واقعی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسولؐ کا
نواسہ، سلطانِ حجاز و عراق کا فرزند ملک عرب کا سب سے زیادہ
سخی و جواد جس کے گھر سے کبھی کوئی سائل محروم نہیں پھرا۔ بنی
ہاشم کا بزرگ خاندان، یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف
نہیں تھا اور کسی کو ان کے انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔
حسینؑ نے یہی زمانہ جو کہ تمام قبائلِ عرب کے اجتماع کا تھا مکہ

میں اپنے قیام کیلئے تجویز کیا۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ حسینؑ اپنے لیے کوئی بڑا لشکر جمع کرنا چاہتے تھے اور ان قبائل عرب کے ساتھ روابط بڑھا کر اپنی حیثیت کو مضبوط بنا کر یزید سے مقابلہ کا خیال رکھتے تھے، نہیں، ہرگز نہیں اگر وہ ایسا چاہتے تو کر سکتے تھے اور مضبوط تحریک ہونے کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ اس میں کامیابی نہ ہوتی۔

یمن بالکل نزدیک تھا جس کا اسلام علی بن ابی طالبؑ کا رہینِ منّت تھا اور اس کی وجہ سے وہاں رہنے والوں کو علیؑ بن ابیطالبؑ اور ان کے گھرانے سے پوری ہمدردی حاصل تھی۔ طائف بھی کچھ اولادِ رسولؐ کا مخالف نہ تھا لیکن فرزندِ رسولؐ کو عالمگیری اور جہانبانی کا شوق نہ تھا۔ وہ اپنے تئیں ایک عظیم الشان بادشاہ تسلیم کرانے کی ہوس نہ رکھتے تھے۔ مگر حسینؑ کا قیام مکہ معظمہ میں صرف اس لیئے تھا کہ جمہورِ عرب

کے اندر صورتِ حالات کی طرف ایک توجہ پیدا ہو جائے اور یزید کے افعال و اعمال کا چرچا ہونے لگے۔

حسینؑ کے قتل کیلئے حجاج کے لباس میں کچھ لوگ بھیجے گئے ہوں یا حضرت کے پابہ زنجیر کر لیے جانے کا سامان کیا گیا ہو بہر حال نامعلوم اسباب و علل کے ماتحت امام کا بیت الحرام سے رخصت ہونا اور زمانۂ حج کے گزرنے کا انتظار بھی نہ کرنا اس کو امام کے تبلیغی مقصد میں پورا دخل ہے۔

ایکا ایکی خلافِ توقع حسینؑ کا حج کو ترک کر دینا اور تمام اہلِ و عیال کیساتھ مکہ معظمہ سے نکل کھڑا ہونا ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا اس نے تمام قبائلِ عرب کے نمائندوں میں ایک لہر دوڑا دی اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

حسینؑ بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا، ان تمام

اہل وعیال واقربا کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں

چھوڑ دیا؟ (یزید کے خوف سے) کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟

(حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے) لاحول ولا قوۃ۔ بھلا ایسا

کیونکہ ہو سکتا ہے؟ فرزندِ رسولؐ اور یزید ایسے شرابخوار اور

زناکار فاسق و فاجر کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظمہ میں

کیوں قیام نہ کیا؟ کس لئے حج کو بھی ترک کر دیا؟ جان کا

خطرہ تھا شاید مکہؐ میں حسینؑ کو قتل کرنے کیلئے شام سے کچھ لوگ

بھیجے گئے تھے۔ توبہ، توبہ، اس سے بڑھ کر سفاکی وظلم کیا ہوگا

کہ فرزندِ رسولؐ کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا جائے۔

یہ تذکرے وہ ہوں گے جو کہ مکہ معظمہ اور اس کے اطراف

وجوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بہت اہمیت کیساتھ جاری

تھے۔

وہ زمانہ کہ جب ترک مراسلت و مخابرت مسدود تھے

تار، ٹیلیفون وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے بڑھ

کر کوئی طریقہ واقعات کی اشاعت کا نہیں ہو سکتا تھا مکہ سے

لوگ روزانہ جاتے رہتے تھے اور آتے بھی رہتے تھے جو شخص تازہ

اپنے شہر میں آیا۔ اس کو بھی تازہ واقعات کے ضمن میں حسینؑ کے

نقل و حرکت اور اس کے اسباب وعلل کا بیان کرنا ضروری تھا۔

اس کا نتیجہ یہ نہیں تھا کہ امام کے لیئے کوئی بڑا لشکر جمع ہو جائے

لیکن مطلب صرف اتنا تھا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت

ہو جانے کے سبب حسینؑ کی شہادت عام طور سے نامعلوم اسباب

وعلل کا نتیجہ قرار نہ پائے تاکہ اہل شام کو اپنے دل سے اس کیلئے

مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع مل جائے اور حسینؑ کی مظلومیت

وحقانیت مخفی ہو جائے یقیناً اگر امام کی طرف سے ان طرق

نشر و اشاعت کو عمل میں نہ لایا جاتا تو یزید کی طرف سے

امام کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے۔ اس کا
نتیجہ یہ ہوتا کہ حسینؑ کا خون رائیگاں چلا جاتا بایں معنی کہ آپ
اپنی جان سے ہاتھ کھوتے اور کوئی ہمدردی بھی افرادِ بشر کے
قلوب میں چھوڑ کر نہ جاتے اور نہ وہ مقصود جو آپ کا تھا،
حاصل ہوتا مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ امام شہید ہوئے اور تمام
دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ ناحق قتل کیے گئے، شام
کا حاکم اور اس کے دشمنِ انسانیت وزراء اور ساتھی کسی تہمت
تراشنے کا بھی موقع نہ پا سکے۔ ایسے خداوندِ عالم کی قوت قاہرہ
کے بعد حسینؑ کے تدبر سے تعلق ہے اور وہ اسباب و علل شہادت
کے نشر و اشاعت کا نتیجہ تھا۔ حسینؑ نے اپنی نقل و حرکت کے
وجوہ کو زندگی ہی سے عالمِ اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی
زبانیں بند کر دیں اور اپنی مظلومی کے سامنے دنیا کے سر تسلیم کو
خم کرا لیا اور اس سے بڑھ کر حقانیت کی تبلیغ اور کیا ہو

سکتی ہے۔

حسینؑ کا قافلہ خاموش مبلغ تھا۔

حج کا زمانہ تھا۔ عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے۔ ادھر امام حسینؑ اپنے اہلِ و اقربا و انصار و اصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب ساتھ لیئے ایک بڑے قافلے کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستہ میں چار، پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ پھر کہاں امام حسینؑ کا شاندار قافلہ اور اصحاب و اعوان کا مختصر لشکر۔ اس پر طرہ یہ کہ حج کے دو دن باقی رہے۔ مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لیئے متوجہ ہے! یہ وجوہ یقیناً جاذبِ نظر اور جالبِ توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو

یہ پوچھنا ضروری تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے ؟ کہاں جا رہا ہے

اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے

قبل درج کئے ہیں چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں

فرزوق سے ملاقات امام سے یونہی اتفاقی طور پر

ہوئی تھی اور عبد اللہ بن مطیع و عمر بن عبد الرحمٰن مخزومی بھی

راستہ میں خلافِ توقع امام سے دوچار ہو گئے اور پھر جو گفتگو

ہوئی وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حسینؑ بن علیؑ اور ہاشمی

جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو بمجبوری چھوڑ کر جنگلوں

میں راہ پیما تھا خود ایک خاموش مبلغ اور داعیٔ حق تھا جو

دور کے لوگوں کو تحقیق حالات اور کشف حقائق پر

مجبور کر دیتا تھا۔

کربلا کی سرزمین پر تبلیغ :۔ راستہ کے تمام اہم واقعات

کو چھوڑتے ہوئے امام کی اس عظیم الشان تبلیغ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ جو کربلا کی سرزمین پر حسینؑ سے ظاہر ہوئی وہ وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امام پر راستہ بند کر دیا تھا اور تیس ہزار کے لشکر نے دین و مذہب بلکہ انسانیت وغیرت کو خیرباد کہہ کر فرزندِ رسولؐ کے قتل پر کمر باندھ لی تھی ان کا گمراہی سے باز آنا ناممکن تھا اور حسینؑ اسباب سے واقف تھے لیکن ایک مبلّغ مذہب اور داعیٔ حق کا فریضہ ہے وہ حق کی آواز کو بلند کر دے اور تبلیغ و دعوت میں کوتاہی نہ کرے اور اس فرض کو امام نے خوب ادا کیا۔

ایک شب کی مہلت نماز کیلئے اور مفادِ اسلام کی بے نظیر تبلیغ

۹ محرم کو اس وقت کہ جب خونخوار لشکر کی یورش

بھی حسینؑ اور انکی مختصر جماعت کے قتل کیلئے حملہ کر دیا تھا۔ حسینؑ

نے اپنے بھائی کو بھیج کر ایک شب کی مہلت مانگی۔ کیوں؟

کیا اس لیئے کہ حسینؑ اپنے اہلِ حرم سے رخصت ہو لیں۔ اپنے

عزیزوں کو دل بھر کر ایک رات اور دیکھ لیں یا ایک شب میں

کوئی سامانِ جنگ کر لیں؟ نہیں، بلکہ صرف اس لیئے کہ آج کی

رات بھر خدا کی عبادت کر لیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ شب

اس طرح گزاری کہ "لہم دوی کدوی النحل" اس جماعت کی آواز

میں ذکرِ الٰہی اور تسبیح کے ساتھ اس طرح گونج رہی تھیں جیسے

شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے۔

اس طرح انہوں نے دکھلا دیا کہ سخت ترین مواقع پر کس

طرح اصولِ مذہب کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہ کہ مذہبی جذبہ

عالم کے ہر جذبہ سے زیادہ طاقتور ہے۔

دسویں عاشورہ کے دن نمازِ ظہر

گزشتہ موقع سے اور زیادہ سخت اور کٹھن وہ موقع تھا جب لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ حسینی مختصر لشکر کے بہت سے جوان قتل ہو چکے تھے اور کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ تیروں کی بارش تھی اور کمانوں کے کڑکنے کی گرج لیکن اس حالت میں بھی نماز ظہر باجماعت ادا کی گئی اور ایسی نماز کہ جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

امام رو بہ قبلہ اور مجاہدین کی صفیں پیچھے اور دو بہادر جوان امام کے آگے سینہ سپر بنے ہوئے کہ جو تیر آئے وہ اپنے اوپر روکیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نماز ختم ہوتے ہوتے ان دونوں بہادروں میں سے ایک سعید بن عبداللہ حنفی زمین پر گر کر تڑپنے لگتے ہیں اور دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

یہ تھے حقانیت کے مظاہرات اور صداقت کے نمونے

جو اگرچہ اپنے وقوع میں خاموشی کے ساتھ عمل میں آئے لیکن

انہوں نے دنیا کو دعوتِ حق کی پُر زور آواز سے مملو کر دیا اور

افرادِ اسلام کے اسلامی احساسات کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور

دوسری طرف یزید اور ہوا خواہان یزید کے ظالمانہ افعال اور

اسلام کش حرکات کا پردہ چاک کیا۔

تبلیغ حق کے دیگر مظاہرات۔ عاشورے کی صبح

سے لے کر عصر تک کے واقعات اگر ہم لکھنا چاہیں تو یہ مضمون

کافی نہیں ہو سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حسینی فوج کا ہر جوان ایک

مبلغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بریر ہمدانی کا مباہلہ حبیب بن

مظاہر کا مکالمہ، زہیر بن قین کا خطبہ اور دیگر تمام انصار و

و اقربا کے وہ رجز جن میں سے ہر ایک عینی شہادت کے

اسباب و علل بیان کرنے میں ایک مبلّغ کا حکم رکھتا تھا۔

اس کا اثر ظاہر ہو یا نہ ہو لیکن ایک مبلّغ کی کامیابی یہ نہیں ہے

کہ اس کی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ سخت اور کٹھن موقعوں پر دشوار گزار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کر دے اور جو دعوت و اظہار کا حق ہے اس کو پورا کر سکے۔

حسینیؑ فوج کے تمام جوان دادِ شجاعت دے کر رخصت ہو چکے۔ ہاشمی خاندان کے شیر بھی اپنے بزرگ کی حمایت میں کام آ گئے صرف مظلوم حسینؑ باقی ہیں اور دشمنوں کا حلقہ ہے۔ دل پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دنیا تاریک ہے مگر وہ مبلغ الٰہی ربانی داعی مذہب اپنے فریضہ سے ایک سیکنڈ کے لیئے غافل نہیں ہے۔ وہ خطبے پڑھتا ہے، تقریریں کرتا ہے۔ صحابۂ رسول کو گواہ بنا کر اپنی حقیقت کا ثبوت دیتا ہے کیا اس امید پر کہ یزیدی لشکر حسینؑ کی حالت پر رحم کھائے گا یا درہم و دینار کی جلوہ آرائی اور روپیہ اشرفیوں کی جھنکار اور حکومت و سلطنت کی طمع و

حرص سے آزاد ہو کر حق کے راستے پر آجائے گا؟ لا واللہ! حسینؑ
بھولے اور ناعاقبت اندیش نہ تھے۔ وہ خوب جانتے تھے مگر
بنی نوع بشر کو حالات سے واقف اور باخبر بنانا چاہتے تھے
انہوں نے کوئی دقیقہ اظہارِ حق میں اٹھا نہیں رکھا اور آخری
نفس تک اپنے فرض کو ادا کر گئے۔

اسوقت بھی کہ جب شمر کا خنجر بوسہ گاہِ مصطفےٰ آص کے قریب
آچکا تھا اور امامت کا چراغ گل ہو رہا تھا حسینؑ نے اپنے قاتل
کے سامنے تبلیغ کی اور اپنے نانا کی صداقت و حقانیت کو ثابت
کر دکھایا "اے شمر ذرا اپنے چہرے سے نقاب اٹھا"۔ شمر نے نقاب
ہٹائی۔ حضرت نے فرمایا صدق واللہ جدی۔ "میرے نانا رسولؐ
نے سچ کہا تھا کہ اے حسینؑ تیرا قاتل ایک ابرص (کوڑھی) ہوگا
روحی لک الفدا! اے حسینؑ بن علیؑ آپ نے مرتے دم تک اپنے
فریضہ سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آپ نے اپنے نانا کے قول کی تصدیق

زیر خنجر بھی ثابت کر دی۔ آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی زمین پر گر رہا تھا آپ کی مظلومیت کا مرثیہ خواں اور ملت اسلامیہ کا واحد مبلغ تھا۔

واقعۂ کربلا کے چند روشن پہلو

ایثار و مواسات:۔ مشترکہ ضرورت کے وقت دُوسرے کو اپنے نفس پر مقدم کرنا ایثار ہے اور سخت موقع پر دوسرے کو مبتلا پاکر خود کو شریک مصیبت اور ہمدرد ہو جانے کا نام مواسات ہے۔

ان دونوں صفتوں کا بہتر اور مکمّل ترین نمونہ زمینِ کربلا کے مجاہدین نے پیش کیا۔ ان میں سے ہر فرد نے امام کے نفس کی حفاظت کو اپنے نفس و بدن پر اس طرح مقدم سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے تئیں جیتے جی معدوم سمجھ گئے تھے۔

سید الشہداء مصلے پر نمازِ ظہر ادا کر رہے ہیں اور دشمنوں کے تیروں کی بوچھاڑ ہے سعید بن عبداللہ اور زہیر بن قین امام کے

سامنے سپر بنے ہوئے کھڑے ہیں اور ابھی نمازِ صبح ختم نہیں ہوتی کہ سعید زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں۔

اور خود امام نے مفادِ ملیؔ کی حفاظت کو اپنے نفس بلکہ نفس سے عزیز تر اولاد اقربا، اور ان سے بھی بالاتر عزت و ناموس پر اس طرح مقدم کیا کہ خود دنیا کی ہر چیز سے ہاتھ دھو لیا اور اپنے کو عالم بھر کے مصائب و آلام کا نشانہ بننا گوارا کر لیا لیکن دینِ اسلام کو قائم کر گئے اور مواسات کا یہ عالم کہ کوئی مصیبت انصار و اصحاب پر نہیں پڑی جس میں امام نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو۔ انصار و اعزاؔ کی شہادت کے عنوان مختلف تھے لیکن جب امام مظلوم کی شہادت پر ایک نظر کی جاتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک عنوان کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ ایک بے کس کے قتل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اس ایک ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔

حسینؑ اس دن صرف اپنی جان نہیں دے رہے تھے بلکہ دنیا

کو ایثار و مواسات کا نہ بھولنے کے قابل سبق دے رہے تھے اور

بے نظیر مثال قائم کر رہے تھے۔

ثباتِ قدم و استقلال:۔ سخت اور دشوار گزار مصائب کے

باوجود قدم میں لغزش نہ ہونا ثبات و استقلال ہے اور اس امتحان میں

کربلا کے مجاہدین کا نمبر سب سے اوّل ہے ان کے سخت اور دشوار گزار

مصائب کی نوعیّت عالم سے جداگانہ تھی۔ سر و گردن کے باہمی ارتباط

کا ایک مرتبہ دم شمشیر سے قطع ہو جانا ایک جانباز سپاہی کے نزدیک

کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن تین دن کی بے آبی اور زخموں کی کثرت

کے سبب کلیجہ کے اندر آگ کا بھڑکنا ہر لحظہ احتضار و نزعِ روح کی

تکلیف برداشت کرنے سے کم نہ تھا۔ کمسن بچوں کو ماہیٔ بے آب کی

طرح تڑپتے دیکھتا اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کے عزیز ترین سرمایہ

اولاد کو کھنچی ہوئی تلواروں اور برستے ہوئے تیروں میں بھیجنا نہیں

بلکہ اپنے ہاتھ پر جگر کے ٹکڑے کو نشانۂ تیر بنوا دینا ہر انسان کا کام

نہیں۔ ان کے استقلال وثباتِ قدم کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے

قاصر ہے اور انہوں نے اس کے ذریعے جو حیرت انگیز کامیابی

حاصل کی اس کی مثال بھی ملنا ناممکن ہے۔ وہ فنا نہیں ہوئے بلکہ

ہمیشہ کیلئے خود زندہ ہوئے اور ہزاروں کو زندہ کر گئے دَورِ فلک

میں جب تک اسلام کا دَور ہے ان کی یاد ہیچے مسلمانوں کے دل میں

ہمیشہ تازہ رہے گی اور سرشکِ غم کے سبحۂ صد انہ پر ان کے نام کا وِرد

ہوتا رہے گا۔

عزتِ نفس اور موت کا موازنہ

مجاہدِ کربلا کا نعرۂ شیرانہ

الموت اولی من رکوب العار

زندگی عزیز شے ہے اور فطرتِ انسانی میں حیاتِ دنیا کی

محبت ودیعت کر دی گئی ہے انسان اسی کی خاطر سخت ترین

دنیا کی مشکلات کو برداشت کرتا اور سرد و گرم عالم کا تحمل کرتا ہے

اس کی طبیعت اگر افراط بخل وغیرہ کے سبب حدِّ اعتدال سے خارج

نہیں ہو گئی ہے تو وہ اپنی جان کی حفاظت میں مالی قربانی سے بھی

دریغ نہیں کرتا اور تمام ممکن ذرائع جن سے اس کی ہستی کا بقا ممکن

ہے ان کو صرف کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام نے بھی اس فطری

رجحان کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں پائی بلکہ لا تلقوا بایدیکم

الی التھلکۃ کے حکیمانہ حکم سے حفاظتِ نفس اور زندگی کی

نگہداشت کو فریضۂ لازمہ قرار دیا لیکن فلک اعظم کے دور اور لیل و

نہار کی آمد و رفت میں ایسے نازک مواقع بھی پیش آجایا کرتے ہیں جب

جذبات نفسانیہ میں تلاطم اور طبعی و عقلی رجحانات میں تصادم ہوتا

ہے زندگی اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں

نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھ بند کر لیتا ہے اور وہ

اُسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر شے قربان کرتا تھا، ہاتھ دھونے

میں لذت محسوس کرتا ہے یہ صورت کبھی غیر عقلی، شہوانی، جاہلانہ

ناعاقبت اندیشانہ رجحانات سے پیدا ہوتی ہے اور اس موقع پر
جان دینے سے نہ عقل بڑھکر مرحبا کہتی اور نہ شرع شاباش کی
آواز دیتی ہے لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی یا زندگی سے
بہتر موت میں معاملہ پڑ گیا ہو جس وقت حیات دنیا اہم ترین
مقاصد کے پامال ہونیکا پیش خیمہ ہو اور جس وقت عزتِ نفس اور
فنائے ظاہری کا سوال درپیش ہو جبکہ میزانِ عقل نے صورتحال
کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے موت کو حیات پر ترجیح دیدی ہو تو
اس وقت موت کے منہ میں جا پڑنے والے دائمی حیات کے مالک ہو جاتے
ہیں عزت دار ہستیاں ہمیشہ عزت کا صدقہ جان کو سمجھتی ہیں حسینؑ ابن علیؑ
نے کربلا میں اپنے لیے جو راستہ مقرر کر لیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا
ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اگرچہ وسیع صحرائے کربلا میں گونج کر
فنا ہو گئے لیکن ان کا پائیدار مفہوم اب بھی غیرت دار اقوام کے صحیفۂ حیات
کا سرنامہ اور ان کے دیباچۂ زندگی کا عنوانِ اوّل ہے الموت اولی من

رکوب العار" ننگ وعار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے"

ان کے یہ مختصر الفاظ علو ہمت کی منادی اور عزت نفس کے ترجمان ہیں

اور انہی کو حسینؑ نے عملی صورت میں دنیا کو دکھلا دیا۔

اصول کی حمایت اور قربانی

حسین کی قربانی دنیا سے نرالی ہے

اس قربانی کے انتظامات عجیب و غریب تھے

کربلا کے مجاہد حسینؑ بن علیؑ کا اصولِ حق کی حمایت، شریعت اسلامیہ کی نگہداشت اور جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں روحانی و مذہبی خود داری کی حفاظت تھی۔ انہوں نے اپنے آخری نفس تک اس اصول کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا وہ اگر پہلی ہی مرتبہ اپنی جان کی قربانی پیش کر دیتے تو بہت ممکن ہے اس قسم کی قربانی کم سہی لیکن بےمثال نہیں ہے۔ سقراط نے بھی اپنے ہاتھ سے زہر کے جام کو اٹھا کر پی لیا تھا اور اپنی جان کو مقصد پر سے قربان کر دیا تھا لیکن حسینؑ

بن علیؑ کا مقصد بہت اہم تھا اور وہ اپنی قربانی کی نوعیت ہی عالم سے جداگانہ قرار دینا چاہتے تھے ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر عزیز شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کریں اور جب اپنے نفس کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے تو اس متاعِ گراں مایہ کو قربانی کے میدان میں پیش کر دیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے راحت و آرام، وطن کی اطمینانی زندگی کو قربان کیا جس کے سلسلہ میں ان کو ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔

روزِ عاشورہ کی قربانیوں کے سلسلے میں اپنے محبوب ترین اصحاب و انصار ساتھ کے کھیلے ہوئے احباب کو قربان کیا۔ عزیزوں کی باری آئی اور ایک ایک کر کے ان سب کو میدانِ قربانی میں بھیجا اپنے داہنے بازو، اپنے وفادار بھائی قمرِ بنی ہاشم کو قربان کیا اپنے پیارے بھتیجے اور داماد قاسم بن الحسنؑ کو قربان کیا۔ اپنے دل کی قوت آنکھوں کی روشنی اور پیری کے سہارے علی اکبر کو قربان کیا

باغِ امید کی آخری کونپل اور غنچۂ ناشگفتہ علی اصغرؑ کو خود اپنے ہاتھوں پہ لا کر قربان کیا۔ ابھی تک دل کے ٹکڑوں کی قربانی ہو رہی تھی اب اعضائے بدن تک نوبت پہنچی۔ ان کو ایک ایک کر کے قربان کیا۔ گوشت و پوست، سینۂ دوست دل و جگر، چہرہ و جبیں بلکہ سطح جسم کا چپّہ چپّہ اور اجزائے بدن کا ہر ذرہ قربان کیا۔ نوبت یہ پہنچی کہ تیروں کو جگہ نہ ملتی اور دشمنوں کی تلواروں نیزوں کو جُستجو کے بعد بھی خالی مکان نظر نہ آتا تھا۔ جب جسم کا ہر حِصّہ اور دل کا ہر ٹکڑا قربان ہو چکا اصحاب و انصار اہلِ بیت میں سے تو پہلے ہی کوئی باقی نہ رہا تھا۔ اعضائے جسم کی قربانی کا بھی امکان نہ رہا، ایک نیزے پر سینکڑوں نیزے اور ایک تلوار پر سینکڑوں تلواریں پڑ چکیں اور تیر بھی اپنا پورا حوصلہ نکال چکے اب حسینؑ کیلئے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کوئی قربانی کے قابل شے باقی نہیں رہی تھی صرف ایک رشتۂ حیات تھا جو روح و بدن کے

اندر پوری کشمکش حیات کے باوجود قائم تھا اور ایک سر وگردن

کا ارتباط تھا جس میں اب تک جدائی نہ ہوئی تھی۔

اس باہمت مظلوم کیلئے گزشتہ تمام قربانی کے مرحلوں کو طے کرنے

کے بعد ایک قربانی کا مرحلہ بالکل آسان تھا بلکہ اس میں خاص لذت

محسوس ہو رہی تھی۔ عصر کے ہوتے ہوتے حسینؑ اس قربانی میں بھی

کامیاب ہو گئے اور خنجر شمر سے کچھ دیر راز و نیاز کے بعد ایک

طرف نفس کی آمد و شد کا سلسلہ اور نفس و بدن کا ظاہری حلقۂ

اتّصال قطع ہوا اور دوسری طرف سر و گردن کے ارتباط میں جدائی

پیدا ہوئی۔

آسماں لاکھوں برس گردش کرے۔ زمانہ کے ورق گوناگوں

خصوصیتوں کے ساتھ سامنے آئیں اور الٹ جائیں لیکن اتنی شان

دار مکمل، منتظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔

∴

اِمامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن، پاکستان

ایک تعارف

اک کاروانِ شوق ہے

اک قافلۂ عشق ہے۔

جذبۂ صادق سے سرشار نوجوانوں کا اک گروہ، جو اپنی تمام تر نادانیوں کے باوجود بھرپور لگن کے ساتھ مقدور بھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیئے سرگرمِ عمل ہے جس کے متعلق جناب سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے مشہور خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ اسلام کی ایسی دعوت ہے کہ اگر فقط اسے ادا کر دیا جائے تو اسلام کے سب حقوق و فرائض خود بخود ادا ہو جائیں۔

تنظیم کا پس منظر

اِس گروہ کے ساتھیوں کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ لاہور کے شیعہ طلباء کی مختلف بکھری ہوئی تنظیموں نے ۱۹۶۳ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں جمع ہو کر اتحادِ عمل کی اہمیت کے پیشِ نظر مل جل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنا اجتماعی نام شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن۔ (ایس۔ ایس۔ اے)

رکھا۔ یہ دوست ۱۹۷۲ء تک اسی نام سے آگے بڑھتے رہے۔ یہانتک کہ ۱۹۷۲ء میں ان ساتھیوں نے اپنے حلقۂ احباب کو مزید وسعت دینے اور تنظیم کو زیادہ بہتر انداز میں آگے بڑھانے کا تہیہ کیا اس ارادہ کی تکمیل کے سلسلہ میں ملک کی دوسری طلبہ نے بھی تعاون کیا۔ جس کے نتیجہ میں ۲۲۔ مئی ۱۹۷۲ء کو یونیورسٹی آف انجنیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور میں اِن سب تنظیموں کا ایک اجلاس ہوا جس میں یہ طے پایا کہ اب ہمارا یہ کارواں امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آئی۔ ایس۔ او) کے نام سے جادہ پیما ہوگا۔ ان احباب نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اِس تنظیم کا مرکز، قلبِ پاکستان لاہور میں رہے گا۔

ان مُٹھی بھر ساتھیوں کی نیتیں اتنی خالِص تھیں کہ جلد ہی یہ تنظیم ملک کے تمام گوشوں میں پھیل گئی اور پنجاب، بلوچستان، سرحد، بلتستان اور پارہ چنار تک کے تمام اہم شہروں میں اِس کے ساتھیوں کی اچھی خاصی تعداد پیدا ہو گئی نیز ڈویژن اور یونٹ قائم ہو گئے۔

طلبہ تنظیم کیوں؟

آئمہ اہلبیت علیہم السلام نے نوجوانانِ ملّت کو یاد کیا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے بزرگوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ تبلیغِ دین کے لئے نوجوانوں سے ربط وضبط بڑھائیں کیونکہ ان میں بھلائیوں کی طرف لپکنے کی بھرپور صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم

نوجوان طلبہ حیَّ علیٰ خیرالعمل کے پُرجوش نعرے کے ساتھ ایک طرف طلبہ
اور دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے
برادری اور نوجوان ساتھیوں کو اپنے ساتھ مل کر قدم بڑھانے
کی دعوت دیتے ہیں اور دوسری جانب بزرگانِ محترم سے یہ توقع رکھتے ہیں
کہ وہ انشاءاللہ ہماری اصلاح و تربیت کے سلسلہ میں اپنے فرائض
سے غفلت نہیں برتیں گے۔

ہمارا نصب العین

ہمارا نصب العین یہ ہے کہ نوجوان نسل خصوصاً طلبہ کی زندگی
اور کردار کو حضرات محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کی سیرت و تعلیمات کے
مطابق استوار کیا جائے نیز انہیں اس قابل بنادیا جائے کہ وہ پوری
توانائیوں کے ساتھ عہدِ حاضر کی تاریکیوں، فتنہ پردازیوں اور
چیرہ دستیوں کے مقابلہ کے قابل بنیں تاکہ وہ اچھے انسان اور باکردار
مومن بن کر دینِ مبین کی سربلندی اور اپنی اخروی نجات کا سامان
فراہم کر سکیں۔